درس ۱۰

تعمیر سیرت کی اساسات

اور قرآن کا انسان مطلوب

سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

(۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ○ ﴾

وقال تبارک وتعالٰی فی سورۃ المعارج :

﴿ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ○ ﴾ ـــ صدق اللّٰہ العظیم

انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے' اس کے جزوِ اول کے بارے میں' جو اس لائحہ عمل کا اہم ترین جزو ہے' ہم نے سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے' کہ دونوں مقامات پر اولاً بھی صلوٰۃ کا ذکر آیا اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں مقامات پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورۃ المومنون میں خشوع و خضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورۃ المعارج میں مداومت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی

درس ۱۰

تعمیر سیرت کی اساسات

اور قرآن کا انسان مطلوب

سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

(۲)

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیمِ — بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوْنَ ○ ﴾

وقال تبارک وتعالیٰ فی سورۃ المعارج :

﴿ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ○ ﴾ — صدق اللّٰہ العظیم

انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے' اس کے جزوِ اوّل کے بارے میں' جو اس لائحہ عمل کا اہم ترین جزو ہے' ہم نے سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے' کہ دونوں مقامات پر اولاً بھی صلوٰۃ کا ذکر آیا اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں مقامات پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورۃ المومنون میں خشوع و خضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورۃ المعارج میں مداومت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی

سورتوں میں قرآن حکیم میں اسی اصطلاح کو دیکھتے ہیں، مثلاً : "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" اور "وَالَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ"۔

اس پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء (اعراض عن اللغو اور زکوٰۃ) کے ضمن میں ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں جن کا دونوں سورتوں میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان میں ایک تو ترتیب عکسی ہے، یعنی سورۃ المومنون میں پہلے اعراض عن اللغو کا ذکر ہے اور بعد میں زکوٰۃ اور تزکیہ کا ــــ جبکہ سورۃ المعارج میں پہلے زکوٰۃ اور تزکیہ کا ذکر ہے اور پھر ایمان بالآخرہ اور ایمان بالقیامہ کا، جس کا اعراض عن اللغو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان دونوں اوصاف کے بیان میں دونوں مقامات پر تعبیر کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ قدرے مختلف ہیں اور ان سے ہمیں ان دونوں کی اصل حقیقت اور اصل روح کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

لغو کاموں سے پرہیز

ہم اِس وقت سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی ترتیب کے مطابق گفتگو کریں گے۔ اس میں مُفلِحین کا جو دوسرا وصف آیا ہے وہ "اِعراض عَنِ اللَّغو" ہے ــــ لغو کا مفہوم معصیت یا گناہ نہیں ہے بلکہ وہ کام مراد ہے جو خواہ فی نفسہٖ مباح ہو، اس کی شریعت میں ممانعت نہ ہو، لیکن انسان کو اس کا کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ قرآن مجید انسان کے وقت کی قدر و قیمت کے معاملہ پر بہت زور دیتا ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ یہی انسان کا اصل سرمایہ اور راس المال ہے۔ اس وقت ہی سے انسان کو بنانا ہے جو کچھ بھی بنانا ہے اور اس وقت ہی میں بننا ہے جو کچھ بھی بننا ہے۔ لہٰذا اس وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہئے۔ یہ وقت یا تو کسی حقیقی دنیوی ضرورت کو پورا کرنے میں صرف ہو، یا اس کے ذریعہ سے آخرت کے لئے کوئی کمائی کی جائے۔ ہر وہ کام جس سے نہ تو کوئی دنیوی ضرورت حاصل ہو رہی ہو اور نہ اس کے ذریعے انسان آخرت کے لئے کوئی کمائی کر رہا ہو تو ایسا کام "لغو" شمار ہو گا، خواہ وہ ممنوعات کی فہرست میں شامل نہ ہو، وہ حرام و ناجائز نہ ہو، وہ معصیت اور گناہ نہ ہو۔ اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے بایں

الفاظ بیان فرمایا : ((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهُ مَالَا یَعْنِیْهِ)) یعنی انسان کے دین اور اسلام کے حسن و خوبی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو ترک کر دے جو لایعنی ہو' جس کا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچ رہا ہو۔ تو ہر لایعنی اور غیر مفید کام کو چھوڑ دینا "اعراض عن اللّغو" ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ اصل میں اس کا گہرا تعلق ہمارے تصورِ حیات سے ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کی زندگی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ بس یہی کل زندگی ہے' کوئی بعث بعد الموت اور آخرت نہیں' کوئی جزا و سزا نہیں' پھر تو ظاہر بات ہے کہ اپنی معاشی ضروریات سے جو وقت بھی بچ رہا ہو گا وہ اس کا کوئی مصرف تلاش کرے گا کہ کوئی Hobby اور مشغلہ ہو' کوئی Amusement اور تفریح ہو' وقت گزاری (to pass time) کے لئے کوئی شغل ہو۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ دراصل اس دنیا کی زندگی تو ایک دیباچہ اور مقدمہ ہے' اصل کتاب زندگی تو موت کے بعد کھلے گی : ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ' لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ ﴾ (العنکبوت : ۶۴) "اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے' کاش انہیں معلوم ہوتا"۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے جس میں حضورؐ نے وہ نتیجہ بیان فرمادیا جو اس حقیقت کے انکشاف سے برآمد ہوتا ہے۔ فرمایا الصادق والمصدوق ﷺ نے : ((اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ)) "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" ـــــ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے ـــــ ظاہر بات ہے کہ دنیا کے بارے میں یہ حقیقت منکشف ہونے کے بعد اب اس دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو گیا۔ ہمیں اس میں بونا ہے تاکہ اسے ہم آخرت میں کاٹ سکیں۔ لہٰذا جس کے دل میں یہ ایمان بالآخرۃ ہو گا وہ اپنے وقت کی جس طرح قدر و قیمت کا احساس کرے گا ایسا اُس شخص کا معاملہ نہیں ہو سکتا جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ سورۃ العصر جہاں سے ہمارے اس سلسلۂ درس کا آغاز ہوا' اس میں ہم نے جو پہلا لفظ پڑھا وہ ہے ﴿ وَالْعَصْرِ ○ ﴾ "زمانہ کی قسم ہے"۔ یہ زمانہ تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ یہی تمہارا راُس المال ہے۔ اس کے بارے میں ایک مفسر نے بڑی عبرت انگیز مثال پیش کی ہے کہ برف کا ایک تاجر چلاتا ہے کہ لوگو! رحم کرو! اگر میرا یہ برف فروخت نہ ہوا

تو میرا جو راس المال ہے وہ پگھل جائے گا۔ میں یہ بات ہنری ورڈز ورتھ کی ایک نظم Psalm of life کے حوالے سے بیان کیا کرتا ہوں جس میں شاعر نے اس حقیقت کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے :

Art is long and time is fleeting
And our hearts though stout and brave
Still, like muffled drums are beating
Funeral marches to the grave

اس وقت کی قدر کرو' یہ بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اور جس طرح کسی اہم فوجی شخصیت کا جنازہ ڈھول کی ہر ضرب کے ساتھ قبر سے نزدیک تر ہوتا جاتا ہے اسی طرح ہمارے دل کی ہر دھڑکن گویا ہمیں ہماری قبر سے قریب تر کر رہی ہے۔

یہ احساس اگر سامنے ہو تو معلوم ہو گا کہ وقت کی کیا قدر و قیمت ہے! لہٰذا یہاں تعمیرِ سیرت کے ذیل میں جو دوسرا وصف بیان ہوا وہ ہے "اِعراض عَنِ اللَّغو" اور اس پر سورۃ المعارج کے ان الفاظ سے روشنی پڑی : ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ "وہ لوگ جو روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں"۔ قیامت کے دن کو مانتے ہیں ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝﴾ "اور وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب کے خیال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ : ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝﴾ "بے شک ان کے رب کا عذاب چیز ہی ایسی ہے جس سے بے خوف اور نچنت ہوا ہی نہیں جا سکتا۔"

زکوٰۃ پر کاربند رہنا

تیسرا وصف سورۃ المومنون میں یہ بیان ہوا : ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝﴾ "اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں" ـــــ میں نے پہلے بھی توجہ دلائی تھی کہ جب قرآن مجید میں زکوٰۃ کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ فعل "اِیتاء" آتا ہے مثلاً اِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ' يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ' اٰتَى الزَّكٰوةَ' اٰتُوا الزَّكٰوةَ ـــــ لیکن یہاں اسلوب مختلف ہے۔ یہاں فرمایا گیا : ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝﴾ ـــــ اس میں ایک تو

دراصل زکوٰۃ کی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی اور دوسرے یہ کہ "فَاعِلُونَ" فرما کر اس بات کو واضح کیا گیا کہ وہ لوگ یہ عمل مسلسل کرتے رہتے ہیں ـــــ یہاں اس بات کو جان لیجئے کہ زکوٰۃ کا اصل مفہوم اور اس کی بنیادی حقیقت کیا ہے! جیسے "ف ل ح" کے مادے سے ہم نے فلح کا مفہوم سمجھا تھا ایسے ہی "ز ک ی" کے حوالے سے ہمیں اس کا اصل مفہوم سمجھنا ہو گا۔ اسے آپ ایک مالی کے عمل پر قیاس کر کے بخوبی سمجھ سکیں گے جس نے ایک باغیچہ لگایا ہے' جس میں کچھ پودے اُس نے خود لگائے ہیں جو پھل دار ہیں' یا پھول دار ہیں۔ لیکن اسی باغیچہ میں خود رَو گھاس اور کچھ جھاڑ جھنکاڑ بھی اپنے آپ اُگ آتا ہے اور یہ خود رَو گھاس یا جھاڑ جھنکاڑ اِن پودوں کے نشوونما میں رکاوٹ بنتا ہے۔ زمین میں جتنی قوت نمو ہے اسے اگر یہ خود رَو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ نہ کھینچ رہے ہوں تو یہ ساری قوت نمو اُن پودوں کو ملے گی جو اس مالی نے خود لگائے ہیں' ورنہ یہ گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی اس میں سے اپنا حصہ وصول کریں گے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ خود رو چیزیں ان پودوں کے لئے ہوا کی آکسیجن اور سورج کی تمازت حاصل کرنے سے رکاوٹ بن رہی ہوں۔ لہٰذا مالی اپنے کھرپے کے ذریعے سے' جو ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے' اس باغیچہ کے اندر سے تمام خود رو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کو علیحدہ کر دے گا۔ مالی کا یہ عمل "تزکیہ" ہے۔ چنانچہ اس کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ کسی شے کی نشوونما میں جو رکاوٹ ہو اس کو دور کر دینا تزکیہ ہے۔

اب اس بات کو جان لیجئے کہ ہر انسان' ہر فرد نوع بشر اللہ تعالیٰ کی کیاری کا ایک پودا ہے جو اس نے لگایا ہے۔ چنانچہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ پروان چڑھے' پھلے پھولے' اس میں جو استعدادات اللہ نے ودیعت کی ہیں وہ پورے طور پر بروئے کار آئیں اور نشوونما پائیں۔ اس طرح انسان اپنے اس اصل مقام کو حاصل کرلے جس کے لئے اللہ نے اسے بالقوہ (Potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اس کی اس نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" کے مصداق ان تمام چیزوں کو جمع کریں گے تو وہ ہے دنیا کی محبت۔ چنانچہ آپ قرآن مجید میں بار بار دیکھیں گے کہ جہاں انسان کی گمراہی اور بے راہ روی کے اصل سبب کی تشخیص ہوتی ہے وہاں عموماً یہ بات آئے گی :

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا○ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی○﴾ (الاعلیٰ : ۱۶'۱۷) "تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی"۔ کہیں فرمایا جاتا ہے : ﴿کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ○ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ○﴾ ہم سورة القیامہ کے درس میں ان آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تمہارے دل حُبِّ عاجلہ میں گرفتار ہو گئے ہیں اور تم آخرت کو نظرانداز کرتے ہو ــــــ اور عاجلہ سے مراد یہ دنیا ہے۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے آیئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حب دنیا کا سب سے بڑا نشان' اس کی سب سے بڑی علامت (Symbol) حب مال ہے۔ سورة الفجر میں فرمایا : ﴿وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا○﴾ "تم مال سے بڑی محبت کرتے ہو اور تم پر اسے جمع کرنے کی دُھن سوار رہتی ہے"۔ اور سورة الھمزة میں فرمایا : ﴿اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ○﴾ "(تباہی ہے اس شخص کے لئے) جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشے گا"۔ پس یہ مال کی محبت ہی انسان کے اخلاقی ارتقاء اور اس کی اعلیٰ اقدار کی نشوونما میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس رُخ پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کی شخصیت ترقی اور نشوونما پائے' اس کا ارتقاء ہو' اس کی تعمیر ہو' اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی مال کی محبت ہے ــــــ لہٰذا اس مال کی محبت کو دِل سے کھرچنے کے لئے نسخہ انفاق مال ہے۔ یعنی مال کا اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے خرچ کرنا ــــــ وہ خیرات وصدقات کی صورت میں محتاجوں' مسکینوں' یتیموں' بیواؤں کی مدد میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ قرابت داروں کا حق ادا کرنے میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ پیغام الٰہی کی نشرواشاعت کے لئے صرف ہو رہا ہو۔ وہ دین کی سربلندی اور غلبہ کے لئے اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے صرف ہو رہا ہو۔ یہ ہے اصل میں "عمل تزکیہ" ــــــ یہ کرتے رہو گے تو دل سے مال کی محبت ختم ہو گی' جو اصلاً علامت ہے حب دنیا کی۔ اور حب دنیا کا یہ بریک (Brake) اگر کھل گیا' اس کی گرفت ختم ہو گئی تو اب تمہاری گاڑی پوری رفتار کے ساتھ اس شاہرہ پر چلے گی کہ جس پر چل کر

تم تعمیر ذات' تعمیر خودی' تعمیر شخصیت اور تعمیر سیرت و کردار کے باب میں ترقی کر سکو گے۔

اب اس ارتقاء و ترقی کے لئے قرآن مجید نے ایک دوگونہ پروگرام بتایا ہے ___ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ صلوٰۃ میں وہ نماز بھی شامل ہے جو فرض ہے' جس کو آپ نے ہر حالت میں ادا کرنا ہے' جس کے لئے روزانہ پانچ فرض نمازوں کا نظام موجود ہے' اور اس کے ساتھ ہی نفل نمازیں بھی صلوٰۃ کے زمرے میں شامل ہیں ___ اسی طرح اس زکوٰۃ کے عمل کے بھی دو اجزاء کر دیئے گئے۔ ایک "زکوٰۃ" تو لازم اور فرض ہو گئی اور اس کے لئے ایک خاص حد معین کر دی گئی ہے جسے "نصاب" کہا جاتا ہے۔ یعنی مالی حیثیت سے اس سے زائد جو بھی ہے اس پر شرح نصاب کے مطابق لازماً رقم لے لی جائے گی۔ اس کی ادائیگی فرض ہے۔ اس کو اصطلاحاً زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

لیکن عمل تزکیہ تو دائم ہے۔ اس میں صرف زکوٰۃ مفروضہ ہی نہیں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مزید انفاق مال کی ترغیب ہے۔ جیسے ہم آیہ البر میں پڑھ چکے ہیں : ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ' وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ﴾ ___ یہاں فرض زکوٰۃ کا علیحدہ سے ذکر ہے اور اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ "اس نے مال محبوب ہونے کے باوجود اسے قرابت داروں' یتیموں' مساکین' مسافروں' سوال کرنے والوں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کیا" ___ لہٰذا مطلوب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اور دو' بڑھ چڑھ کر دو ___ اس کی جب آخری حد پوچھی گئی کہ حضورؐ کہاں تک دیں؟ تو قرآن مجید میں اس کی وضاحت فرمائی گئی : ﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ' قُلِ الْعَفْوَ﴾ "یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں! تو (اے نبی!) ان سے کہئے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے اسے دے ڈالو"۔ پھر مزید تشویق و ترغیب کے لئے فرمایا : ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ "تم نیکی (کے بلند ترین مقام) تک نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ اللہ کی راہ میں وہ چیز صرف نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے" ___ اب یہ ہے وہ عمل تزکیہ جس کی ترغیب و تاکید قرآن مجید میں بار بار آتی ہے۔ آخری پارے کی سورۃ الشمس میں نفس انسانی کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿

وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ ﴾ "گواہ ہے یہ نفس انسانی اور جو اللہ نے اسے بنایا اور سنوارا (اور اس میں طرح طرح کی صلاحیتیں اور بہت سی استعدادات ودیعت فرمائیں-) پھر اس میں نیکی اور بدی کا شعور بھی الہامی طور پر پیدا فرما دیا- تو جس کسی نے اس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک آلود کر دیا وہ ناکام و نامراد ہوا" ـــــ یہی بات ہم سورۃ الاعلیٰ میں دیکھتے ہیں : ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ ﴾ "کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کر لیا اور اس نے اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز ادا کی" ـــــ سورۃ الاعلیٰ کی یہ دو آیتیں سورۃ المومنون کی ان آیات سے بہت مشابہ ہیں : ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ○ ﴾

تو یہ تھے تعمیر سیرت کے قرآنی پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء ـــــ یعنی ایک "اِعْرَاض عَنِ اللَّغو" جس کا براہ راست تعلق ایمان بالآخرہ اور ایمان بالقیامہ سے ہے' اور دوسرے تزکیہ پر مسلسل عمل پیرا رہنا- اسی کے لئے سورۃ المعارج میں یہ الفاظ آئے : ﴿وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ○ ﴾ "وہ لوگ کہ جن کے اموال میں حق ہے' جو جانا پہچانا ہے' سائل کے لئے بھی اور محروم کے لئے بھی"-

جنسی جذبہ پر قابو رکھنا

اب ہم سورۃ المومنون کی آیات ۵ تا ۷ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں- یہ تینوں آیات بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۃ المعارج (آیات ۲۹ تا ۳۱) میں بھی وارد ہوئی ہیں :

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ ﴾

"اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں- سوائے اپنی بیویوں اور باندیوں کے' پس ان کے معاملہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں- پھر جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے"-

تعمیر سیرت کے جس قرآنی پروگرام کا ہم سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ کے حوالہ سے مطالعہ کر رہے ہیں اس میں چوتھا وصف یا اس کا چوتھا جزو جنسی جذبہ پر قابو رکھنا ہے ـــــ یہ بات اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ انسان میں بہر مختلف قسم کے حیوانی میلانات اور داعیات ہیں ان میں سے ایک اہم میلان جنسی جذبہ بھی ہے۔ انسان کا پیٹ کھانے کو مانگتا ہے اس سے اس کی اپنی زندگی کا تسلسل وابستہ ہے۔ اسی طرح تمام حیوانات میں اپنے نسلی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے فاطر فطرت نے جنسی جذبہ ودیعت کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دورِ جدید کے ایک بہت بڑے ماہر نفسیات فرائڈ نے جنسی جذبہ کو انسان کے محرکات عمل میں سب سے زیادہ قوی جذبہ قرار دیا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو تسلیم نہیں کرتے ' ہمارے نزدیک یہ اس کا مغالطہ ہے ' اس کی نگاہ میں ایک چیز بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اور انسانی فکر کا یہ خاصّہ ہے کہ بسا اوقات کوئی ایک چیز انسان کے ذہن پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ باقی تمام چیزیں اسے اس کے تابع نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی معاملہ فرائڈ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنی جگہ پر جنسی داعیہ ایک بہت بڑا محرک اور نہایت قوی جذبہ ہے۔

اس ضمن میں اگر ہم تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانوں میں افراط و تفریط کی دو انتہائیں نظر آتی ہیں ـــــ ایک طرف انسان نے اس جذبہ کو فی نفسہٖ شر قرار دیا کہ یہ ہے ہی سر تا سر برائی یہ برائیوں کی ماں ہے۔ اسی لئے ہمیں ایک بہت بڑے طبقہ میں یہ خیال ملے گا کہ جنسی جذبہ فی نفسہٖ شر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مذاہب میں روحانی ترقی کا راستہ تجرد کی زندگی کے ذریعہ سے اختیار کیا گیا کہ ساری عمر شادی بیاہ نہ کیا جائے ' گھر گرہستی کا کھکیڑ نہ پالا جائے ' اس لئے کہ یہ راستہ ہے ہی برائی کا ' اس میں کوئی خیر ہے ہی نہیں۔ یہ رہبانیت کا نظریہ ہے جو دنیا میں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے رائج رہا ہے۔

اس ضمن میں دوسری انتہا یہ ہوئی کہ اپنے اس جنسی جذبہ کی آزاد اور بے قید طریق سے تسکین کرنا ' اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ کرنا اور صحیح و غلط کے فرق د

امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنا' جیسے خیالات کو روا رکھا گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نوع انسانی جن بہت بڑی بڑی گمراہیوں میں مبتلا ہوئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جذبہ Pervert ہو کر' یعنی کج رو ہو کر فطرت کی جو ایک معین راہ ہے اس کی بجائے دوسرے راستے اختیار کرتا ہے۔ تو تاریخ انسانی میں یہ دو انتہائیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

ان آیات میں قرآن مجید کا جو متوازن بیان ہمارے سامنے آتا ہے اس کے متعلق یہ بات اہم ہے کہ تین تین آیات دونوں مقامات پر (سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج میں) اس شان سے وارد ہوئی ہیں کہ ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے' اور جیسا کہ ہم آخر میں دیکھیں گے کہ یہاں سات اوصاف زیر بحث آئے ہیں جن میں سے تین پہلے ہیں' تین بعد میں ہیں' مرکزی بحث یہی ہے۔ پھر اس مسئلہ پر دونوں مقامات پر تین تین آیات وقف کی گئی ہیں۔ تو اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان آیات میں ہمارے سامنے جو متوازن بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قانون شریعت کے دائرہ میں رہ کر حلال پر اکتفا کرتے ہوئے ایک انسان اپنے فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے تو فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ اس میں کوئی ملامت کی بات نہیں ہے' اس میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ حضور ﷺ نے تو صاف طور پر فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ)) "اسلام میں رہبانیت بالکل نہیں ہے"۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) نکاح کرنا' شادی بیاہ کرنا' گھر گرہستی کی زندگی اختیار کرنا میرا طریقہ ہے' یہ میری سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ لہٰذا تعمیر سیرت اور اخلاقی ترفع حاصل کرنے کے لئے ترک دنیا والی روش اسلام کی روش نہیں ہے' وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ وہ حضورؐ کا طریقہ نہیں ہے۔

لیکن دوسری طرف اس کے لئے حد بندیاں کر دی گئیں۔ دوسرے ناجائز راستے بند کر کے نکاح کا جائز راستہ کھول دیا گیا کہ اس راستہ سے انسان اپنے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔ اس کے لئے حدیث میں یہاں تک فرمایا گیا کہ ایک بندۂ مومن کے لئے یہ عمل بھی عبادت کا ایک جزو بن جاتا ہے' جب کہ یہ فعل اس قاعدہ' اس ضابطہ اور قانون کے تابع رہ کر ہو رہا ہو جو اللہ نے اس کے لئے معین فرما دیا ہے۔

اسلام میں ملکِ یمین کی حیثیت

ان آیات میں ضمنی طور پر ایک مسئلہ ایسا بھی سامنے آیا ہے جس کے بارے میں بہت سے سوالات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے جو قانونی راہ ہے اس کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید دونوں مقامات پر ﴿اِلاَّ عَلٰی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ﴾ کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ یعنی بیویوں کا ذکر بھی ہے اور باندیوں یا لونڈیوں کا بھی۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ بھی ہے اور بڑا تفصیل طلب بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائیں تو ان شاء اللہ تمام اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ لونڈیوں یا غلاموں کا ادارہ (Institution) اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو لازم نہیں ہے۔ لونڈی یا غلام رکھنا فرائض میں سے ہے نہ واجبات میں سے۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تو معاشرہ میں یہ ادارہ بالفعل موجود تھا' اور جیسے بہت سی دوسری چیزیں ایسی تھیں جو اصلاح طلب تھیں ویسے ہی یہ ادارہ بھی اصلاح طلب ادارہ کی حیثیت سے موجود تھا۔ جس طرح اسلام نے دوسری چیزوں میں اپنے اصلاحی پروگرام کو تدریجی طور پر آگے بڑھایا' ایسے ہی اس معاملہ میں بھی اسلام نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اجراء فرمایا۔ سب سے پہلی اصلاح یہ ہوئی کہ یہ بات بار بار فرمائی گئی کہ یہ لونڈی غلام تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔ یہ صرف ایک relationship ہے جو دنیا میں تمہارے اور ان کے مابین قائم ہو گئی ہے' جیسے ایک آجر (employer) ہے اور ایک مستاجر (employee) ہے لیکن بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ پس اگر یہ اونچ نیچ کہیں چلی آ رہی ہے کہ کوئی آقا ہے اور کوئی غلام ہے تو بحیثیت انسان وہ مساوی ہیں۔ لہٰذا آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ تم خود کھاتے ہو اپنے غلاموں کو وہی کچھ کھلاؤ' اور جو کچھ تم خود پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کے ساتھ محبت'

شفقت اور حسن سلوک رکھو۔ ایک طرف تو یہ اخلاقی تعلیم جس کے ذریعہ سے ان کی تالیف قلبی کی گئی۔ یعنی وہ انسان جو گرے ہوئے تھے' دبے ہوئے تھے' پسے ہوئے تھے' نبی اکرم ﷺ نے ان کو اس حالت سے اٹھا کر آزاد انسانوں کے برابر لانے کی کوشش فرمائی۔ اس کی دشمن بھی گواہی دیتے ہیں۔ ایچ جی ویلز' جو حضور ﷺ سے بہت دشمنی رکھتا ہے' وہ بھی گواہی دیتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے یہ پروگرام واقعتاً روبعمل لاکے دکھایا۔

تیسری بات یہ کہ اسلام نے ان کی آزادی کا ایک راستہ کھول دیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں مکاتبت کا حکم آیا۔ یعنی اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ معاہدہ کرلے کہ میں اتنی رقم (اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر) تمہیں ادا کردوں گا تو اس آقا کو از روئے شریعت پابند کیا گیا ہے کہ وہ اس غلام کے ساتھ معاہدہ کرے۔ اب وہ غلام محنت کرکے کمائی کرے اور طے شدہ رقم اپنے آقا کو دے دے تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں کوئی آقا انکار نہیں کر سکتا کہ میں تمہارے ساتھ یہ معاہدہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ان کی آزادی کے لئے پہلی شکل یہ اختیار کی گئی۔ چنانچہ فرمایا گیا : ﴿وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ.....﴾ (النور : ۳۳) "اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کرلو....."۔ ﴿فَکَاتِبُوْھُمْ﴾ فعل امر ہے اور امر وجوب کے لئے بھی آتا ہے۔ پھر تمام مسلمانوں حتیٰ کہ ان کے آقاؤں کو بھی تلقین کی گئی کہ تم اس معاملہ میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور صدقہ و خیرات سے ان کی مدد کرو۔ چنانچہ اسی آیت میں جس میں مکاتبت کے لئے حکم آیا ہے آگے چل کر فرمایا : ﴿وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ﴾ "اور دو ان کو اللہ کے مال میں سے جو اس نے تم کو دیا ہے۔" یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے اس کی ملکیتِ حقیقی کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرما رہا ہے۔ یہ دوسری شکل ہے جو قرآن مجید نے اختیار کی۔ اس طرح ان کی تالیف قلبی' ان کے رتبہ کی بلندی اور ان کی آزادی کی راہ نکلی۔

پھر آپ کو یاد ہو گا کہ مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے دوسرے سبق میں ہم نے حقیقی نیکی کو سمجھنے کے لئے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ کا مطالعہ کیا تھا' جسے میں "آیت البر" سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ وہاں گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے عمل

کو اعلیٰ ترین نیکی کے کاموں میں شمار کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۶۰ میں صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ کے مستحقین کی جو آٹھ مدات مقرر فرمائی گئی ہیں' ان میں بھی گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے لئے زکوٰۃ سے رقم ادا کرنے کی مد بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ سورۃ البلد میں بڑے پیارے انداز میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ فرمایا : ﴿ فَلاَ اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ ﴾ "انسان گھاٹی کو عبور کر نہیں پاتا اور تم جانتے ہو کہ وہ گھاٹی کون سی ہے!" اس گھاٹی کی جب تفصیل بیان کی گئی تو سب سے پہلے ذکر ہوا : "فَكُّ رَقَبَةٍ" یعنی "کسی گردن کو آزاد کرا دینا" ــــ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دفترِ فضائل کا ایک درخشاں باب یہ بھی ہے کہ آپؓ نے غلاموں اور کنیزوں کے طبقے میں سے اسلام قبول کرنے والے چھ مسلمانوں کو' جن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں' ایک خطیر رقم دے کر خریدا اور ان کو آزاد کیا ــــ حضرت عثمان ذُوالنورین رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ میں جس روز سے ایمان لایا ہوں (اور اندازہ کیجئے کہ آپؓ سابقون الاولون میں سے ہیں' ایمان لانے والوں میں آپؓ کا چھٹا نمبر ہے) اُس روز کے بعد سے کوئی جمعہ مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے ایک غلام آزاد نہ کیا ہو' اور اگر اتفاقاً کسی جمعہ کو میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا تو اگلے جمعہ کو میں نے دو غلام آزاد کئے یا کرائے ــــ پھر شریعت کے احکام کی بعض فروگذاشتوں کے کفارہ کے طور پر ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا یا کرانا قرار دیا گیا ــــ تو یہ ہیں وہ تدابیر جو اسلام نے اس مسئلہ کی اصلاح کے لئے اختیار کیں۔

اس تیسری بات کے ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اسلام نے اس بات کو سب سے بڑے گناہوں یعنی کبائر میں سے قرار دیا ہے کہ کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنا لیا جائے ــــ اسلام میں صرف ان لوگوں کو غلام اور لونڈی بنایا گیا ہے جو خالص قتال فی سبیل اللہ کے نتیجہ میں محاذِ جنگ پر گرفتار ہوتے تھے۔ ان کو کبھی فدیہ لے کر' کبھی بطورِ احسان اور کبھی مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دیا جاتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی صورت مصالح دینی کے لحاظ سے مناسب نہ ہو تو ان کو مسلمان معاشرہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اسلام نے ان کے لئے حسن سلوک کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات دی ہیں۔

اِس وقت دنیا میں جو سب سے زیادہ متمدن اور مہذب ترین مملکت کہلاتی ہے' یعنی امریکہ' اس میں جو کالے ہیں وہ بھلا کون ہیں؟ انہیں افریقہ سے اس طرح پکڑ کر جس طرح شکاری گھات لگا کر شکار کو زندہ پکڑتے ہیں' جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح لاد کر بطور غلام امریکہ لے جایا گیا۔ وہاں ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی' حالانکہ وہ اپنے ملک کے آزاد باشندے تھے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ بعد میں امریکی سوسائٹی نے کسی حد تک اپنے آباء و اجداد کے اس جرم کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ابراہیم لنکن کی عظمت تسلیم کی جانی چاہئے۔ لیکن امریکن ذہناً اب بھی کالوں کو اپنے برابر سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کچھ بھی ہوا اُن لوگوں نے کیا ہے جو صدیوں سے بڑے متمدن اور مہذب ہونے کے مدعی چلے آرہے ہیں' جبکہ اسلام نے اس کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ آپ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنا لیں۔

اب میں چوتھی بات یہ عرض کروں گا کہ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ غلامی کی قطعی و حتمی منسوخی (Final Abolition) کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ جیسے کہ ہم شراب کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں حکم آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ تدریجاً اصلاح کا قدم اٹھایا گیا' اور بالآخر وہ وقت آ گیا کہ فرمایا گیا : ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ "پس کیا تم (اس سے) باز آتے ہو کہ نہیں؟" ـــــ اور ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ "اب اس سے باز آجاؤ" ـــــ اسی طرح سود کی سب سے پہلے سورۃ الروم میں اخلاقی سطح پر مذمت کی گئی۔ پھر سورۂ آل عمران میں سود دَر سود سے منع کیا گیا۔ پھر حرمت کی آخری آیت ۰۹ھ میں حضور ﷺ کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل نازل ہو گئی' جو سورۃ البقرۃ میں ہے اور جس میں ہر نوع کا سود حرام مطلق قرار دے دیا گیا۔ لیکن غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں اس نوعیت کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ ادارہ کچھ عرصہ تک چلتا رہا ہے۔

اب آپ یہ ہدایات پیش نظر رکھئے کہ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ' جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ پھر یہ کہ ان کی گردنوں کو چھڑانے کے لئے

اخلاقی تعلیمات بھی موجود ہوں' جیسے ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ اور صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ میں گردنیں چھڑانے کی مستقل مد رکھ دی گئی ہو۔ تو ان اسلامی تدابیر کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں وہ دَور بھی آیا کہ مشرق و مغرب میں عظیم ترین مملکتیں ان کی تھیں جن کو ممالیک اور غلام کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو خاندان غلاماں حکمران تھا اور مصر میں جو ممالیک کی حکومت تھی تو یہ اُس اصلاحی عمل (Reform) کا نتیجہ ہے جس کا آغاز حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ غلاموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ غلامی سے اٹھا کر شہنشاہی تک پہنچا دیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ غلام تختِ ہند پر متمکن ہے۔ وہ چاہے قطب الدین ایبک ہو یا شمس الدین التمش جیسا درویش صفت اور ولی اللہ بادشاہ ہو۔ اسی طرح آپ کو دَورِ خلفائے راشدینؓ' دَورِ بنو اُمیّہ اور دَورِ بنو عباس میں علوم دین کی مسندوں پر بہت سے ایسے اکابر جلوہ افروز نظر آئیں گے جو آزاد کردہ غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے' اور جن کی جوتیاں سیدھی کرنا اور اٹھانا بنو امیہ اور بنو عباس کے باجبروت بادشاہوں کے شہزادگان اپنے لئے بہت بڑی سعادت خیال کرتے تھے۔

لیکن بہرحال اگر حکمتِ خداوندی نے اس کی آخری تنسیخ نہیں کی —— اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی ہے جو اِس ادارہ کو حتمی و قطعی طور پر منسوخ قرار دیتی ہو —— تو ہمیں بحیثیت مسلمان اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان و اعتماد رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے کہ کہیں معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نسیان سے یہ بات رہ گئی ہو۔ ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ یہ معاذ اللہ کسی بھول چوک سے نہیں ہوا۔ ہمیں بہرحال اپنے علم سے اللہ کے علم کو مقدم رکھنا ہے۔ کہاں ہماری عقل اور کہاں ہماری منطق! کہاں ہمارے فلسفے! جو انتہائی کوتاہ اور محدود ہیں اور کہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں!! تو وہ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور حکمت کاملہ ہے یقیناً یہ اسی کا ظہور ہے کہ قرآن مجید میں اس کی آخری درجہ میں تنسیخ نہیں آئی ——!!!

تعمیرِ سیرت کے لئے آخری تین اوصاف

زیر نظر درس میں انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے

سات نکات پر مشتمل جو لائحہ عمل عطا کیا ہے' اب ہم اس کے آخری تین اوصاف کا مطالعہ کریں گے۔ اس لائحہ عمل کا اولین اور اہم ترین نکتہ اِقامة الصلٰوة ہے' دوسرا فعل الزکٰوة' تیسرا اِعراض عنِ اللغو' اور چوتھا ضبط نفس یعنی جنسی جذبے پر قابو یافتہ ہونا۔ اس لائحہ عمل کے آخری تین اوصاف یہ ہیں۔ (۱) امانت کی پاسداری (۲) ایفائے عہد (۳) اپنی شہادتوں پر قائم رہنا۔

اب اگر آپ ایک خاص اعتبار سے غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پہلے تین اوصاف کا تعلق ایک شخص کی اپنی ذات کے ساتھ ہے' کوئی دوسرا شخص ان سے متعلق نہیں ہوتا۔ نماز کو قائم رکھنا' بے کار اور بے مقصد باتوں سے اعراض' اللہ کی راہ میں خرچ کرنا' یہ تو خالص ذاتی نوعیت کے اوصاف ہیں۔ چوتھا وصف وہ تھا کہ جس پر انسانی تمدن کی صحت کا دارومدار ہے۔ اس لئے کہ انسانی تہذیب و تمدن میں خاندان کے ادارے کو جڑ اور بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ عائلی زندگی اور خاندان کے ادارے کی صحت اور استحکام کا دارومدار اس پر ہے کہ انسان اپنے جنسی جذبہ پر قابو اور ضبط رکھتا ہو' اسے کسی غلط رُخ پر نہ پڑنے دے۔

اب جو آخری تین اوصاف ہیں جن پر ہمیں اجمالاً گفتگو کرنی ہے' ان کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کی اس سطح سے ہے جسے ہم ملی اور سیاسی زندگی کہتے ہیں۔ یعنی حکومت کا نظام' نظامِ مملکت' قومی و ملی معاملات۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ تین اوصاف نہایت ضروری ہیں۔ ان میں سب سے پہلا وصف امانتداری اور دوسرا ایفائے عہد ہے۔

امانت داری اور پاسِ عہد کا ذکر سورۃ المعارج میں بھی ہے اور سورۃ المومنون میں بھی۔ اور دونوں جگہ پر ایک شوشے کے فرق کے بغیر بعینہٖ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں :
﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○﴾ امانت داری اور ایفائے عہد کے مابین جو ربط و تعلق ہے اور ان کی جو اہمیت ہے وہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو مسلسل دس برس تک حضور ﷺ کے خادم خاص رہے ہیں' اور اس کو روایت کیا

ہے امام بیہقی رحمہ اللہ نے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ : قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلاَّ قَالَ "شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں آپؐ نے یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں" ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لاَ اَمَانَۃَ لَہٗ وَلاَ دِیْنَ لِمَنْ لاَ عَھْدَ لَہٗ)) "جس میں امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے' اور جس میں ایفائے عہد کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے" —— اس لئے کہ ایمان کا امانت داری سے گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کا مادہ ہی ایک لفظ ہے۔ "امن" سے ہی لفظ امانت بنا اور اسی سے ایمان بنا۔ چنانچہ یہ لازم و ملزوم ہیں' ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان ہے تو امانت کا وصف بھی ہوگا' اگر امانت کا وصف نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فتویٰ مبارک کی رُو سے حقیقی و قلبی ایمان بھی نہیں ہے —— اسی طرح دین تو اصل میں نام ہے بندے اور رب کے مابین ایک عہد و معاہدہ کا۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں جب سورۃ الفاتحہ کی یہ مرکزی آیت پڑھتے ہیں : ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ "اے رب ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے" تو یہ اللہ کے ساتھ ایک قول و قرار' ایک معاہدہ اور ایک میثاق ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ کئے گئے عہد نہیں نباہ سکتا' جو انسانوں کے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے نہیں کر سکتا' ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ پوری زندگی کے لئے کیا ہوا اتنا بڑا معاہدہ کیسے نباہے گا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((لَا دِیْنَ لِمَنْ لاَّ عَھْدَ لَہٗ)) ایسا شخص حقیقی دین سے تہی دست ہے۔

ایفائے عہد کے ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب کے دوسرے درس میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ وہاں الفاظ مبارکہ آئے تھے ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا﴾ "اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب کہ باہم کوئی معاہدہ کرلیں"۔ اور وہاں تفصیل سے عرض کیا گیا تھا کہ ہمارے جتنے بھی بین الانسانی معاملات ہوتے ہیں ان سب میں کوئی نہ کوئی معاہدہ کارفرما ہوتا ہے۔ جیسے آجر اور مستاجر کا تعلق کسی نہ کسی معاہدہ پر قائم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں عارضی یا مستقل ملازمت کر رہا ہے تو ملازم رکھنے والے اور ملازمت کرنے والے کے مابین کوئی قول و قرار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی بھی ایک

معاشرتی معاہدہ ہے۔

امانت داری اور ایفائے عہد کا ذکر سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج دونوں میں آیا ہے۔ لیکن سورۃ المعارج میں ایک تیسری چیز کا اضافہ کیا گیا ہے : ﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ○ ﴾ "وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں"۔ غور طلب بات ہے کہ اس کا ذکر سورۃ المومنون میں کیوں نہیں آیا! یہ وہ واحد مثال ہے کہ جب ہم نے دونوں مقامات کا تقابلی مطالعہ کیا تو اس کا ذکر ہمیں سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں نہیں ملا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت شہادت بھی ایک امانت ہے۔ اگر کسی وقوعہ کے وقت آپ موجود تھے' آپ کی موجودگی میں کسی نے کسی پر دست درازی کی ہے' کسی نے کسی پر کوئی ظلم کیا ہے' کسی نے کسی کو قتل کیا ہے' کوئی دوسرا حادثہ ہوا ہے' تو آپ کی وہاں موجودگی کی بنا پر جو شہادت آپ کے پاس ہے وہ معاشرہ' قوم و ملت اور ملک کی ایک امانت ہے۔ اگر آپ اسے چھپاتے ہیں تو آپ اس امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو چیز کسی فعل میں آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے قرآن حکیم کہیں اس کا ذکر نہیں کرتا اور کہیں اس مضمر شے کو بھی عیاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہادت بھی درحقیقت ایک امانت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے امانت کے تصور کو اتنی وسعت دی ہے کہ آپؐ نے فرمایا : ((اِنَّ الْمَجَالِسَ بِالْاَمَانَاتِ)) "مجالس بھی امانتوں پر قائم ہیں"۔ کسی محفل میں کوئی بات ہو رہی تھی' آپ بھی اس میں موجود تھے' آپ نے وہاں کوئی بات سنی اور کہیں اور جا کر بیان کر دی جب کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی تو یہ خیانت ہے۔ آپ نے کسی محفل کی بات کو اگر کہیں اور جا کر نقل کر دیا تو غیر شعوری یا شعوری طور پر بات میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور بات کرنے والے کے منشاء کے خلاف بھی بیان ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بات کہنے والے کے صحیح مفہوم کو سمجھ نہ پائے ہوں۔ تو نہ معلوم اس سے کتنے فتنے اٹھنے کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور عین ممکن ہے یہی بے احتیاطی بعض لوگوں کو بعض کے خلاف بدظنی اور بدگمانی میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے اور دلوں میں کدورت اور رنجش ڈیرے ڈال لے۔ تو کسی مجلس اور کسی محفل میں آپ شریک ہیں تو وہاں کی

باتیں آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہیں جن کی آپ کو حفاظت کرنی ہے ـــــ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا : ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) جس کسی سے کوئی مشورہ طلب کیا جاتا ہے گویا اس کے پاس بھی ایک امانت رکھوائی گئی ہے۔ مشورہ طلب کرنے والے نے آپ پر اپنا اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اب اگر آپ دیانتاً جو رائے رکھتے ہیں وہ کچھ اور ہے' لیکن آپ کسی مصلحت سے اپنی اس دیانت دارانہ رائے کو چھپا کر کوئی اور رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپ نے اس کی امانت میں خیانت کی۔ یہ معاملہ بھی' جیسا کہ عرض کیا گیا' شہادت کا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس کے درمیان میں فرمایا گیا ہے : ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ...﴾ (آیت ۱۴۰) "اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے"۔ اِس فرمانِ الٰہی اور امانت و شہادت کے حوالہ سے ہمیں امّتِ مسلمہ کا جو فرض منصبی ہے اسے سمجھنا چاہئے۔ ہمارے پاس اللہ کا کلام ہے' اللہ کی ہدایت ہے' اللہ کا قانون ہے' اور اللہ کی شریعت ہے۔ پھر ہمارے پاس اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ کی سنت ہے' حضورؐ کی احادیث ہیں۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ کامل صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمام امانتیں ہیں جن کو ادا کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے کاندھوں پر رکھی گئی ہے' لہٰذا اِن امانتوں کو ادا کرنا پوری امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس لئے کہ یہ پوری نوع انسانی کے لئے ہیں' صرف ہمارے لئے نہیں ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا وصف رسولِ امین یعنی امانت دار رسولؐ ہے' جن کے پاس پیغام ربانی آیا اور انہوں نے اسے بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا۔ چنانچہ امانت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس پیغام کے پہلے امین ہیں' ان کا لقب بھی رسولِ امین ہے۔ دوسرے امین جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ امانت پہنچائی نبی اکرم ﷺ کو' اور حضورؐ نے یہ امانت پہنچا دی اُمت کو ـــــ اور اسی کو ہم یوں تعبیر کریں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے امت کے سامنے حق کی گواہی دے دی' توحید کی گواہی دے دی' اپنی رسالت کی گواہی دے دی' قرآن کی حقانیت کی گواہی دے دی'

دین و شریعت کے اوامر و نواہی اور ہر ہر فعل و عمل کی گواہی دی' قولاً بھی اور عملاً بھی۔ اب اس امانت اور شہادت کو ادا کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ امت مسلمہ کے کاندھوں پر عائد ہوتا ہے' جس کا ہر وہ شخص ایک فرد اور رُکن ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور کہلواتا ہے۔

ہمارا فرض منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم اس حق کی' اس دین کی' اس توحید کی اور جناب محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں' کہ جن کے توسط سے ہمیں یہ "الھدیٰ" اور یہ "الحق" ملا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آجاتا ہے کہ : ؏ "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی" یہ گواہی ہمیں قولاً بھی دینی ہے اور عملاً اور فعلاً بھی۔ یہ گواہی ہم نے اپنی گفتگو' دعوت و تبلیغ اور اپنی قوت بیانیہ سے دینی ہے۔ یہ گواہی ہم نے اپنے قلم سے' مدلل مضامین و مقالات کی صورت میں دینی ہے' اور یہ گواہی ہمیں اپنے کردار اور اپنی سیرت سے دینی ہے ـــــ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہم کتمانِ شہادت کے بہت بڑے مجرم ثابت ہو رہے ہیں : ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ...﴾

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت سے چند آیات بعد سورۃ البقرہ میں امتِ مسلمہ کا فرض منصبی بایں الفاظ مبارکہ بیان ہوا ہے : ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ یعنی ہم نے تمہیں ایک امت وسط (درمیانی امت) بنایا ہی اس لئے ہے کہ تم ہو جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ سورۃ المومنون کی گیارہ اور سورۃ المعارج کی سترہ آیات کے باہمی تقابل سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے اور ان مضامین کی اہمیت بھی سامنے آ گئی ہے۔ اسی کی ایک مثال اور جان لیجئے۔ سورۃ المومنون سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے۔ سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ہے : ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○﴾ اور سورۃ الحج کی جو آخری آیت ہے اس میں اسی شہادت علی الناس کا ذکر ہے۔ مسلمانوں سے خطاب فرما کر کہا جا رہا ہے :